رموزِ
وسوسہ
WWW.NAFSEISLAM.COM
حضرۃ العلامہ شیخ الاسلام عارف باللہ مولانا حافظ خان بہادر
محمد انوار اللہ فاروقی
فضیلت جنگ قدس اللہ سرہ العزیز بانی جامعہ نظامیہ

رموز وسوسہ

(الوسواس) اس لفظ کے معنیٰ وسوسہ انداز کے لئے جاتے ہیں۔
دراصل وسواس بالفتح اسم ہے اور بالکسر مصدر۔وسوسہ خفی آواز کو کہتے ہیں
جو ہوا کی سنی جاتی ہے۔اور زیور کی آواز کو بھی کہتے ہیں۔ ہر چند وسوسہ دل
میں ہوتا ہے جہاں کسی قسم کی آواز کا وجود نہیں ۔ مگر چونکہ وسوسہ میں باتیں
ہوا کرتی ہیں اور باتوں کا تعلق آواز سے ہے۔اس لئے دل کی باتوں پر
وسوسہ کا اطلاق کیا گیا ہے جس کے معنیٰ خفی آواز کے ہیں اور وسوسے
چونکہ پلٹ پلٹ کر دل میں آتے جاتے ہیں۔اس لئے لفظ وسواس میں
بھی تکرار ہوئی تا کہ تکرار لفظی تکرار معنوی پر دلالت کرے۔اکثر استعمال
اس لفظ کا بُری باتوں میں ہوتا ہے جو دل میں آتی ہیں۔ چنانچہ وسوسۂ
شیطانی کہا جاتا ہے۔چونکہ شیطان ہمیشہ وسوسے ڈالتا رہتا ہے اور کوئی دم
ایسا نہیں گذرتا جس میں وہ وسوسہ نہ ڈالے۔یا اُس کی فکر میں نہ ہو۔اس
وجہ سے اُس پر وسواس کا اطلاق فرمایا گیا۔جیسے زیدٌ عدلٌ کہا جاتا ہے۔یعنی
وسوسے ڈالتے ڈالتے وہ ہمہ تن وسوسہ ہی بن گیا چونکہ شیاطین کی تخلیق اسی
واسطے ہے کہ اسباب شقاوت وضلالت قائم کریں۔اسی لئے وہ کبھی اس

کام سے تھکتے نہیں ۔جس طرح فرشتوں کی تخلیق عبادت کے واسطے ہے جس کی وجہ وہ تھکتے نہیں۔جیسا کہ قرآن شریف سے ثابت ہے۔

اب کہیئے کہ وسوسہ انداز جو پیچھے پڑ گیا اور سوائے اس کے اسے کوئی دوسرا کام ہی نہیں اُس کے شر سے بچنا کیسا مشکل کام ہے۔نفس میں جتنے صفات رکھے گئے ہیں مثلاً شجاعت، جُبن، سخاوت، بخل، صبر، بے صبری، بے حیائی، قناعت، حرص، تکبر، تواضع، رحم جور و جفا وغیرہ ۔ان سب کے استعمال کے طریقے ایسے بتلاتا ہے کہ ذمیمہ تو ذمیمہ اخلاق حمیدہ بھی ذمیمہ ہوجاتے ہیں ۔مثلاً صفت سخاوت کسی میں ہوتو ایسے مصرف پیش کردیتا ہے کہ مال تلف ہوجائے اور بجائے نام آوری کے بدنامی آوری بجائے ثواب کے عذاب حاصل ہو۔مثلاً عیاشی وغیرہ اور اگر ایسے کاموں سے نفرت ہوتو خیال نام آوری اور ریاسمعہ عجب وغیرہ پیش کردیتا ہے۔جس سے سوائے اتلاف مال کے آخرت میں کچھ فائدہ نہ ہو۔

خواہشات نفس: چونکہ نفس میں قوائے شہوانیہ وغضبیہ موجود ہیں ۔اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اپنی کل خواہش پوری کرے اور جتنی خواہشیں ہیں سب کو پوری کرنے کی اجازت بھی حق تعالیٰ نے دی ہے۔

مثلاً عورت کی خواہش ہوتو نکاح کی اجازت ۔اسی طرح کل خواہشوں

کا حال ہے۔مگر شیطان جو آدمی کا دشمن ہے وہ نہیں چاہتا کہ حلال طریقہ سے خواہشیں پوری ہوں جس کی وجہ سے آدمی مستحق ثواب ہی ہو جائے بلکہ وہ مشورت دیتا ہے کہ ناجائز طریقہ سے پوری کی جائیں تاکہ بجائے اس کے کہ مستحق ثواب ہو۔نافرمانی کے جرم میں مستحق عذاب بنادے۔

شیطان جس طرح بت پرستی پر لگاتا ہے ہوا پرستی پر بھی لگاتا ہے جو بت پرستی سے بھی بدتر ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔"قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما تحت ظل سماء من الہ یعبد من دون اللہ اعظم عند اللہ من ھوی متبع کذا فی کنز العمال" یعنی فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ کے سواء جس معبود کی عبادت ہوتی ہے ان میں ہوائے متبع سے بدتر کوئی نہیں۔ہوائے متبع کا مطلب یہ ہے کہ خدا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف حکم بھی کوئی خواہش ہو تو آدمی اُسی کا متبع رہے۔اور حکم شرعی کا کچھ خیال نہ کرے۔ہوا پرستی' بت پرستی سے بدتر ہونے کی وجہ ہے کہ بت پرستی بھی ہوا پرستی کا ایک شعبہ ہے۔جب حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ ہوا پرستی' بت پرستی سے بدتر ہے تو مسلمانوں کو اپنی خواہش کے پورا کرنے میں کس قدر احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔غرض کہ شیطان بذریعہ ہوائے نفسانی آدمی کو تباہ کر کے اپنی خواہش پوری کرتا ہے۔

اگر وساوس شیطانی نہ ہوں تو آدمی نہ دنیا کی پریشانی میں پڑے نہ آخرت میں مصیبت بھگتے۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ شیطان ہمارا جانی دشمن ہے جیسا کہ خدائے تعالیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان کی عداوت اور اُس کی مکاریاں ظاہر کر کے مسلمانوں کو ہدایت فرمادی ہے کہ اس سے احتراز کرو اور اُس کا کہا نہ مانو اور اس کے کہنے کا طریقہ بھی معلوم کرادیا کہ دل میں جو بیہودہ خیالات آتے ہیں وہ وساوس شیطانی ہیں تو اب آدمی کو لازم ہے کہ علم کے ذریعہ سے معلوم کرے۔

بڑا شکر گذار کون؟: کنز العمال میں یہ حدیث وارد ہے کہ ’’عن الاشعث بن قیس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشکرکم عند اللہ اشکرکم للناس‘‘ یعنی فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑا شکر گذار اللہ کا تم میں وہی شخص ہے جو لوگوں کا شکر زیادہ کرے۔ مطلب یہ کہ اپنے محسن کا شکر کرنا گویا خدائے تعالیٰ کا شکر کرنا ہے۔ اگر محسن کا شکر زیادہ کروگے تو زیادہ شکر باری تعالیٰ کا ہو جائیگا۔ کیونکہ محسن صرف واسطہ ہے جس کے ذریعہ خدائے تعالیٰ کی نعمت پہنچتی ہے اگر وسائط بالکلیہ ساقط کردی جائیں تو خدائے تعالیٰ نے جو عالم اسباب میں مصلحتیں رکھی ہیں وہ فوت ہو جائیں گی اور اُن کا فوت ہونا خدا تعالیٰ کو منظور نہیں اسی

وجہ سے حدیث شریف میں وارد ہے ''کما فی کنز العمال ۔عن ابن عباسؓ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من انعم علی اخیہ نعمۃ فلم یشکرھا فدعا علیہ یستجیب لہ ''یعنی جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو کوئی نعمت عطا کرے اور وہ اس کا شکریہ نہ کرے اور محسن اس کی ناشکری کی وجہ سے اُس کے حق میں بد دعا کرے تو خدائے تعالیٰ اس کی بد عا کو قبول فرمالیتا ہے۔اس کی وجہ یہی ہے کہ احسان کا شکر نہ کرنا محسن کے دل کو دکھانا ہے ۔اس دل آزاری کی سزا یہ مقرر ہوئی کہ وہ جو کچھ بارگاہ کبریائی میں اس کی نسبت عرض کریگا وہ قبول ہوجائیگی اس سے ظاہر ہے کہ ہر چند انعام وعطا حق تعالیٰ کی جانب سے ہے مگر جن وسائط وذرائع سے وہ نعمت حاصل ہوتی ہے وہ بھی قابل اعتبار نہیں ۔اگر وسائط نہ ہوں تو انتظام عالم درہم وبرہم ہوجائیگا۔جس کا جی چاہے گا کسی پر ظلم کرکے کہدیگا کہ میں نے کیا کیا وہ تو خدائے تعالیٰ کا فعل تھا اور ہر شخص بحسب اقتضاء شہوات نفسانیہ گناہوں کا مرتکب ہوکر کہے گا کہ میں بری الذمہ ہوں جو چاہا خدا نے کیا۔ یہ درست ہے کہ بغیر مشیت الٰہی کوئی کام نہیں ہوتا مگر بُرا کام کرنے کے وقت آدمی کا مقصود صرف یہی ہوتا ہے کہ اپنی خواہش پوری کرے جس سے تلذذ خلاف امر الٰہی نفس کی حاصل ہو۔اس مقصود کو

پورا کرنے کے بعد اگر یہ چاہے کہ خدائے تعالیٰ پر الزام لگا کر آپ بری الذمہ ہو جائے ۔اس سے پوچھا جائیگا کہ بُرا کام تو تم نے کیا اس میں فعل الٰہی کو کیا دخل؟ تو اس کا یہی جواب دے گا کہ یہ قرآن شریف سے ثابت ہے تو ہم کہیں گے کہ جس طرح قرآن شریف سے وہ ثابت ہے یہ بھی ثابت ہے کہ بُرے کاموں سے خدائے تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور اُس کی سزا مقرر فرمائی ۔اگر قرآن شریف اس قابل ہے کہ اُس پر ایمان لایا جائے تو اس کے کل احکام پر ایمان لانا چاہیے ۔اس کے کیا معنی کہ اپنے مطلب کو آیتوں پر ایمان لاکر استدلال میں پیش کریں اور جن کا اثر نفسانی خواہشوں پر پڑتا ہے اس کو نظر انداز کر دیں اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوائے آیات مشیت الٰہی کے دوسری آیات پر ایمان ہی نہیں جو شخص بعض آیات پر ایمان لائے اور بعض آیات پر ایمان نہ لائے تو اس کے شان میں حق تعالیٰ فرمایا ہے ۔﴿افتؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض فما جزآء من یفعل ذلک منکم الا خزی فی الحیوٰۃ الدنیا و یوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب﴾ یعنی کیا تم بعض آیات پر ایمان لاتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے تو ایسے لوگوں کی جزا یہی ہے کہ دنیا میں رسوا ہوں اور آخرت میں سخت عذات میں ڈالے جائیں ۔

تحقیق یا عمل: الحاصل ایمان کا مقتضےٰ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا ہے سب پر ایمان لائے اور یہ کہیں کہ یہ بات فلاں آیت کے خلاف ہے بلکہ ایسے موقع میں یہ خیال کریں کہ ہر بات خدائے تعالیٰ کی قابل تسلیم ہے اگر اس کی حقیقت نہیں معلوم نہ تو ہمیں اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں' ہمارا کام بقدر استطاعت عمل کرنا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے ''المؤمن کالجمل الانف حیثما انقید انقاد او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم'' یعنی مسلمان کی مثل اُس اونٹ کی سی ہے جس کے نکیل لگی ہوئی ہو اس کا حال یہی ہے کہ جدھر کھینچیں ادھر مطیع و منقاد و فرماں بردار ہو کر چلا جاتا ہے۔ اگر یہ بات اصل نہ ہو تو سمجھا جائے گا کہ وہ سرکش ہے پھر خدائے تعالیٰ کے مقابلے میں کس کی سرکشی چل سکتی ہے۔ الغرض مسئلہ تقدیر ومشیت پیش کر کے گناہوں پر جرأت کرنا مسلمان کا کام نہیں۔ مروی ہے کہ شیطان نے بارگاہ کبریائی میں عرض کیا کہ مجھ سے جو معصیت ہوئی وہ بحسب تقدیر تھی تو پھر یہ لعنت کیوں کی گئی ارشاد ہوا کہ تو نے جس وقت نافرمانی کیا جانتا تھا کہ وہ تقدیر میں ہے کہا نہیں ارشاد ہوا کہ اسی کی سزا ہے جو ملعون ہوا۔

فی الحقیقت جس وقت اُس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اس وقت حسد اور تکبر اس پر اس قدر غالب تھا کہ تقدیر کا خیال بھی اس

کو نہ آیا ہوگا۔ ورنہ صاف کہہ دیتا کہ الٰہی تو نے میری تقدیر میں مخالفت لکھی ہے اس لئے میں سجدہ نہیں کرتا بلکہ بجائے اس کے اس نے یہ کہا کہ میں ہرگز سجدہ نہ کروں گا۔ کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا جو لطیف ہے اور ان کی مٹی سے جو کثیف ہے لطیف کا کثیف کے روبرو سر جھکانا عقلاً خلاف وضع ہے۔

غرضکہ اپنی وضع داری اس وقت اس کے پیش نظر تھی۔ اسی طرح ہر گناہ کے وقت ایک خیال متمکن رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے آدمی مرتکب گناہ ہوتا ہے۔ اور بعد گناہ اگر تقدیر اور مشیت وغیرہ کے مسئلہ میں استدلال کرے تو وہی جواب ہوگا جو شیطان کو دیا گیا تھا۔

علم اور خوف: حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ﴿انما یخشیٰ اللہ من عبادہ العلماء﴾ یعنی خدائے تعالیٰ سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علماء ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہلاء کو خدائے تعالیٰ کا کچھ خوف نہیں۔ آیت شریفہ کی تصدیق کے بعد یہ یقین ہوتا ہے کہ جو لوگ تمامی درسی کتابیں پڑھ کر علماء مشہور ہوتے ہیں اگر ان کو خوف خدا نہ ہو تو ان کو علماء کہنا بے موقع ہوگا ۔ کیونکہ کتابیں پڑھنا اور ہے اور علم کچھ اور چیز ہے۔ یورپ میں اکثر یہود نصاریٰ علوم عربیہ میں ماہر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے فاضل کہلاتے ہیں۔

مگر دین کی راہ سے ان کو علماء نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح اہل اسلام بھی اگر تحصیل کرلیں اور ان میں خوف خدا نہ ہو تو اس آیت شریف کی رو سے ان کو عالم کہنا درست نہ ہوگا۔ دراصل علم اس کیفیت قلبیہ کا نام ہے جو ظن سے متجاوز ہو کر حد یقین میں داخل ہو گئی ہو۔

اب یہاں یہ دیکھنا چاہئے کہ دین میں کونسی چیزوں کا علم معتبر ہے اور اس علم کا معلوم کیا ہے۔ کیونکہ عالم میں بے انتہا چیزیں ہیں جن کا علم دین کے لحاظ سے ضرور نہیں۔

تمام آیات و احادیث سے ثابت ہے کہ آدمی کو خدائے تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے احکام اور اخبار کا علم ضروری ہے۔ یعنی جس طرح خدائے تعالیٰ نے خبر دی ہے اس کا یقین کرلے اور کیفیت یقین حاصل ہو تو وہ علم ہوگا۔

جب آدمی اس بات کو جان لیگا کہ خدائے تعالیٰ کے صفات میں قہاریت بھی ایک صفت ہے اور اسی صفت کا یہ اثر ہے کہ حق تعالیٰ نے بُرے کاموں سے منع فرمایا اور جو لوگ ان کے مرتکب ہوں ان کے لئے دوسرے عالم میں ایک بڑا قید خانہ تیار کیا جس میں ہر قسم کی اذیتیں ہیں تو اس علم کے بعد اس سے گناہ اول تو صادر نہ ہوگا اور اگر ہو گیا تو وہ توبہ

کر لے گا۔ غرضکہ اس علم کے بعد اُس کو خوف بھی نہ ہو گا۔

الحاصل جس کسی کو صفت قہاریت اور اُس کے آثار کا علم ہو گا ممکن نہیں کہ وہ بے وخوف ہو البتہ مدارج علم متفاوت ہوتے ہیں۔ اس لئے خوف کے مدارج بھی متفاوت ہوں گے۔ جس کو کمال درجہ کا علم و یقین ہو گا۔ اُس کو خوف بھی اسی درجہ کا ہو گا۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''انا اخشکم للہ'' میں تم سب سے زیادہ خدائے تعالیٰ سے خوف وخشیت رکھتا ہوں۔

شفاء قاضی عیاض میں یہ روایت ہے کہ عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اُس وقت آپ نماز ادا فرما رہے تھے۔ آپ کے سینہ مبارک سے ایسی آواز سنائی دیتی تھی جیسے دیگ کے جوش کی آواز ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ آپ گریہ کو ضبط فرماتے تھے مگر اندرونی اثر اس کا ظاہر ہو ہی جاتا تھا۔

ہنسا کم رونا زیادہ: شفاء میں ترمذی سے یہ روایت نقل کیا ہے کہ ''عن ابی ذرؓ قال رسول اللہ علیہ وسلم واللّٰہ لو تعلمون ما اعلم نصحتکم قلیلاً و لبکیتم کثیراً و ما تلذذتم بالنساء علی الفروش و لخرجتم الی الصعدات تجارون الی اللّٰہ لوددت

الی شجرة تعضد ''یعنی ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو میں جانتا ہوں اگر تم لوگ جانتے تو بہت کم ہنستے اور بہت زیادہ روتے اور بستروں پر عورتوں سے لذت حاصل نہ کرتے اور خدا کی طرف فریادو فغاں کرتے ہوئے راستوں کی طرف نکل جاتے مجھے آرزو آتی ہے کہ کاش میں ایک درخت ہوتا جو جڑ سے اُکھاڑ دیا جاتا چونکہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان نہایت ارفع ہے۔اس لئے آخری جملہ یعنی ''لو ددت الی شجرة تعضد'' کو محدثین نے ابوذرؓ کا کلام قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ فی الواقع یہی بات ہو مگر ظاہرا بلحاظ سیاق حدیث شریف ہی کا جزو معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی لفظ ایسا نہیں کہ جس سے معلوم ہو کہ ہو ابوذرؓ کا کلام ہے۔اگر آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہو تو بھی چنداں بعید نہیں اس لئے کہ حالت خوف جب دل پر طاری ہوتی ہے تو بیخودانہ ایسی باتیں نکل جاتی ہیں اور اس میں کوئی کسر شان بھی نہیں۔ کیونکہ جب دوسری قسم کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس وقت اسی کے اقتضاء کے موافق کلام صادر ہوتے ہیں۔ اہل تصوف جن پر بحسب مقامات حالات طاری ہوتے رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب کسی مقام سے متعلق کوئی حالت طاری ہوتی ہے اس وقت کیسی بے احتیاطی ہو جاتی

ہے یہی بے اختیاری اس حالت کے مناسب کلام پر مجبور کرتی ہے دوسرے احادیث کثرت سے وارد ہیں جس سے حضرت کی اصل شان کا پتہ چلتا ہے کہ نہ وہ کسی نبی کو حاصل ہے نہ کسی فرشتہ کو اور اس حدیث میں گو ظاہر بینوں کو نظر میں کسر شان معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس میں حضرت کی رفعت شان معلوم ہوتی ہے۔ کیونہ مقام خوف بھی ایک اعلیٰ درجہ کا مقام ہے اور اس کا انتہائی درجہ عدم ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے۔ بہر حال مقام خوف کے آثار و لوازم اسی قسم کے ہوتے ہیں اور اسی پر منحصر نہیں ہر مقام کی بات جدا ہوتی ہے۔

آنحضرت مظہرِ شانِ جمالی: جنگ بدر میں جب کفار کثرت سے باساز وسامان جنگ میں صف آراء ہوئے۔ اور صحابہ تھوڑے اور بے سامانی کی حالت میں یہ دیکھ کر اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک حالت طاری تھی بار بار عرض کرتے تھے کہ الٰہی اگر ان مسلمانوں پر مشرک غالب ہو جائیں اور اس چھوٹی جماعت اہل ایمان کو تو ہلاک کر دیگا تو روئے زمین پر تیری عبادت موقوف ہو جائیگی۔ یا اللہ مجھے رسوا مت فرما' یا اللہ مجھ سے جو تو نے وعدہ فرمایا ہے وہ پورا کر' حضرت' قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر ہاتھ اٹھا اٹھا کر بار بار اس قسم کی دعائیں فرماتے تھے یہاں تک کہ چادر مبارک

دوش مبارک سے گر گئی۔ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چادر دوش مبارک پر اُڑھا کر کہا یارسول اللہ بس کیجئے۔امید ہے کہ قریب میں حق تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرمائیگا۔کیا کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایمان آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یقین سے بڑھا ہوا تھا۔اور معاذ اللہ حضرت کو یقین نہ تھا جس کی وجہ سے اس قسم کی دعائیں کرنے کی ضرورت ہوئی؟ ہرگز نہیں۔کجا یقین صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور کجا یقین سید المرسلین وباعثِ ایجاد کون ومکاں۔مگر بات یہ ہے کہ بڑوں کی بات بھی بڑی ہوتی ہے۔آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت مشاہدہ ذات کبریائی تھا جو تمام عالم سے غنی ہے۔کما قال تعالیٰ ﴿واللہ غنی عن العالمین﴾ وہاں مسلمان تو کیا سارا عالم تباہ ہو جائے تو کچھ پرواہ نہیں اسی ذات پاک کا نام ہادی بھی ہے اور مضل بھی اس مقام میں ارشاد ہے کہ اگر سارا عالم جنت میں چلا ئے تو کچھ پرواہ نہیں اور دوزخ میں جائے تو بھی کچھ پرواہ نہیں۔بہر حال بارگاہ ربانی میں جمال کو ترجیح ہے نہ جلال کو چونکہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم مظہر شان جمالی تھے۔اس وجہ سے آپ کو کمال درجہ کی تشویش تھی کہ کہیں شان جلالی کا ظہور نہ ہو جائے اور یہ تشویش یہاں تک بڑھی کہ گویا بیخودی کی حالت طاری کردی۔

سیرۃ نبویہؒ شیخ دحلانؒ نے علماء کا قول نقل کیا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مقام رجا میں تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقام خوف میں بہر حال جس حالت کا پورا وجود ہوتا ہے۔ دوسرے کل خیالات مضمحل ہوجاتے ہیں۔حق تعالیٰ فرماتا ہے ﴿حتی اذا ستائیس الرسل و ظنوا انهم قد کذبوا جاء هم نصرنا﴾ یعنی یہاں تک (ڈھیل دی تھی) کہ رسول بھی ناامید ہوچکے تھے اور خیال کرنے لگے تھے کہ اُن سے غلط وعدے کئے گئے تھے تب اُن کے پاس ہماری مدد پہنچی۔

خوف ورجاء: اس میں شک نہیں ہے کہ انبیاء کو جو یقین اپنی نبوت کا اور وعد ہائے الٰہی کے پورے ہونے کا ہوتا ہے۔وہ ایسا نہیں ہوتا کہ کسی وجہ سے زائل ہوسکے مگر جب امداد ہی میں بہت تاخیر ہوئی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ شدہ شدہ یاس کی حالت طاری ہوگئی تو اُس وقت بمقضائے بشریت یہ خیال پیدا ہوا کہ وعد ہائے امداد جھوٹے تو نہ تھے جو کسی واسطہ نے اپنی جانب سے کہدیا۔

حالت یاس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ ایسے خیالات پیدا ہوں کیونکہ جو حالت آدمی پر غالب ہوتی ہے اس کے آثار کا ظہور آنا ضروری ہے دیکھئے کسی قسم کی حالت کا جب غلبہ ہوجاتا ہے تو آدمی خودکشی کرلیتا ہے حالانکہ

مقتضائے فطرت انسانی ہے کہ اپنی جان بچانے کی تدبیریں کرے مگر غلبہ حال اس مقتضائے فطرت پر بھی غالب آجاتا ہے۔ شرع شریف نے بھی اس حالت کی رعایت رکھی ہے ۔ چنانچہ حالت اضطراری میں مردار درست ہوتا جاہے مگراسی حد تک کہ وہ حالت ہواسی وجہ سے چند لقموں کے بعد وہ حالت باقی نہ رہے تو مردار جو ضرورتاً حلال ہوگیا تھا پھر مردار ہوجائیگا۔ یہیں سے قیاس ہوسکتا ہے کہ بزرگان دین پر جب سماع وغیرہ میں سچی حالت وجد طاری ہوتی ہے تو بعض کلمات وحرکات ان سے ایسے صادر ہوتے ہیں جو شرعاً وعقلاً ناجائز ہوتے ہیں مگر چونکہ وہ سچی حالت ہوتی ہے اس لئے وہ معذور سمجھے جاتے ہیں۔

الحاصل جب الہات کسی حالت کے جمع ہوجائیں تو وہ حالت ضرور پیدا ہوجائیگی ۔ مثلاً خبر متواتر اور قرآن سے ثابت ہوجائے کہ فلاں مقام میں شیر ہے اور شیر کا مقابلہ بھی ہوجائے تو حالت خوف ضروری طاری ہوگی ہاں یہ بات اور ہے کہ جواں مرد شخص ہواور اس کو اپنے اسلحہ اور قوت ذاتی پر گھمنڈ ہوکر شیر کو مارلونگا تو اس کو خوف نہ ہوگا۔ اور جب یہ خیال ہوگا اُس کے مقابلہ میں سر بر نہ ہوسکیگا تو ضرور خوف کرے گا۔

اب کہئے کہ کون ایسا ہوسکتا ہے کہ اپنی ذاتی قوت اور طاقت پر اس کو

اس درجہ گھمنڈ ہو کہ خدائے تعالیٰ کے مقابلہ میں سر بر ہو سکے۔ اسی وجہ سے تمام انبیاء اور اولیاء خدائے تعالیٰ کی صفت قہاریت پر نظر ڈالتے ہیں تو بے اختیار ان پر حالت خوف طاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان کا ایمان اس پر کامل ہوتا ہے۔ پھر صفات کمالیہ کے پیش نظر ہو جاتے ہیں تو رجاء کی کفیت ان پر طاری ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے علماء نے تصریح کی کہ ''الایمان بین الخوف والرجاء'' دراصل کلام الٰہی اسی کی تعلیم فرماتا ہے چنانچہ ارشاد ہے ﴿انہ لا یائیس من روح اللہ الا القوم الکافرون ''یعنی خدائے تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہونے والے سوائے کافروں کے اور کوئی نہیں ۔ اس سے ظاہر کہ خدائے تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھنا ضروری ہے اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے۔

جنتی کون؟ دوزخی کون؟ ﴿فلا یامن مکر اللہ الا القوم الخاسرون﴾ یعنی خدائے تعالیٰ کے مکر سے بےفکر ہو جانے والے نقصان اٹھانے والوں کے سواء اور کوئی نہیں جس سے ظاہر ہے کہ الٰہی سے خوف رکھنا ضروری ہے۔ کنز العمال میں روایت ہے کہ ''قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من زعم انہ فی الجنۃ فھو فی

النار ''یعنی جو شخص کہے کہ میں جنتی ہوں تو سمجھ جاؤ کہ وہ دوزخی ہے وجہ اس کی یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس کا ایمان آیت شریفہ ﴿فلا یامن مکر اللّٰہ﴾ پرنہیں ہے اور جس کا ایمان پورے قرآن شریف پر نہ ہو۔ اس کا دوزخی ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ﴿افتؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذلک منکم الا خزی فی الحیوۃ الدنیا و یوم القیامۃ یردون الیٰ اشد العذاب﴾ یعنی تھوڑی آیتوں پر ایمان لاتے ہو اور تھوڑی پر نہیں ایمان لاتے ۔ ایسے لوگوں کی جزاء یہی ہے کہ دنیا میں رسوا ہوں اور قیامت میں سخت عذاب میں ڈالے جائیں۔

اب اگر اس پر بھی کوئی کسی قسم کا خیال پیش نظر رکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ میں جنتی ہوں جس کا لازمہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے جن کاموں کے کرنے کا حکم فرمایا ہے وہ نہ کریگا اور جس کاموں کے کرنے سے منع فرمایا ہے وہ کیا کریگا تو اس پر آیت صادق آجائیگی۔ ﴿افمن اتخذ الٰہ ھواہ و اضلہ اللّٰہ علی علم﴾ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی خواہش کو معبود بنالیا اور خدائے تعالیٰ نے باوجود اس کے علم کو اس کو گمراہ کر دیا خواہش کو معبود بنانے کی یہی صورت ہے کہ خدائے تعالیٰ کے ارشاد پر عمل

نہ کر کے اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے پھر ایسے شخص کا ٹھکانا حسب اصول عقلیہ وشرعیہ دوزخ ہی نہ ہو تو کیا ہو۔ الحاصل خواہشات نفسانی کے مطابق تصرفات کرتا ہے۔

شیاطین کے دھوکے: غرضکہ جس طرح خواہشات نفسانی میں اپنا تصرف کرتا ہے۔ اسی طرح تمام اخلاق حمیدہ و ذمیمہ میں اسی قسم کے تصرف کرتا ہے جس کا حال کتب اخلاق میں مصرح ہے۔ احیاء العلوم کی کتاب الغرور یا اُس کا ترجمہ مذاق العارفین دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ کیسے کیسے شیطان کے دھوکہ ہیں جن میں وسوسوں کے ذریعہ سے کامیاب ہوتا ہے۔ اس طرح جسمانی لذتوں سے متعلق وسوسے ڈالتا ہے۔ اور آنکھ کان، ناک، منہ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ سے برے کام کرا کر چھوڑتا ہے۔ اگر اس بیان کی تفصیل لکھی جائے تو ایک بڑی کتاب ہوجائیگی۔ مگر مصداق "العاقل تکفیہ الاشارۃ" کے یہ اجمال بھی کافی ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ ہر ایک امر میں غور وفکر سے کام لیا جائے۔ غرضکہ وساوس شیطانی بے انتہاء ہیں۔ بغیر خدائے تعالیٰ کی پناہ کے ممکن نہیں کہ آدمی اُس کے شر سے بچ سکے۔ جو لوگ پناہ میں پوری طور سے آ کر شیطان کو وسوسہ اندازی اور مکر و تزویر سے بمقتضائے بشریت گناہ کے مرتکب ہو بھی جاتے تو ان کو گناہ کچھ ضرر نہیں

دیتا۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ گناہ سے جو لذت حاصل ہوئی وہ ایک نعمت الہٰی تھی ۔ جس کی تخلیق میں سوائے خدائے تعالیٰ کے کسی کو دخل نہیں ۔ اگر بجائے لذت کے اُس میں مصیبت ہوتی تو ممکن نہیں کہ اُس کا ارتکاب ہوسکتا۔ دیکھئے کیسے ہی لذیذ کھانے مہیا ہوں ۔ مثلاً اگر منہ میں چھالے پڑ جائیں تو بجائے لذت اُن کے کھانے میں اذیت ہوتی ہے ۔ علی ہذا القیاس ہر ایک عضو جس میں جس کو لذت کا احساس ہوتا ہے اُس میں کوئی آفت آجائے تو جس کام سے التذاذ ہوتا وہی کام اُس کے حق میں عذاب ہوجاتا ہے ۔ غرضکہ لذت دینا خدائے تعالیٰ ہی کا کام ہے ۔

اعلیٰ درجہ کا شکر: صحیح حدیث میں وارد ہے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل کی کہ اے موسیٰ تم میرا ایسا شکر کرو جو شکر کرنے کا حق ہے ۔ انھوں نے عرض کی ۔ یا اللہ کس کو یہ طاقت ہے کہ ایسا شکر ادا کرسکے ۔ ارشاد ہوا اے موسیٰ جب تم سمجھ لوگے نعمت میری طرف سے ہے تو یہی اعلیٰ درجہ کا شکر ہوجائیگا ۔ مگر یہ اعتقاد رکھنا بھی ضرور تھا کہ جتنے افعال بندے سے صادر ہوتے ہیں سب کا خالق خدائے تعالیٰ ہے ۔ بخلاف اس کے اگر یہ اعتقاد کرے کہ شیطان اس فعل کا خالق ہے ۔ اس وجہ سے کہ پھر شیطانی فعل تھا تو یہ اعتقاد حد کفر کو پہنچ جائیگا ۔ پھر اس اعتقاد کے موافق

جب اُس فعل میں خدائے تعالیٰ کے خالق ہونے کا خیال کیا جائے تو بحسب شرع شریف اُس پر کوئی الزام عائد نہیں ہوسکتا۔ بشرطیکہ اُس کے ساتھ یہ اعتقاد بھی ہو کہ اس فعل سے خدائے تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ اور اُس کا مرتکب مستحق عقاب ہے۔

فرق خلق افعال وارتکاب افعال: کیونکہ خلقِ افعال اور ارتکابِ افعال میں بیّن فرق ہے۔ اِس کا تعلق خدا تعالیٰ سے ہے اور اُس کا تعلق بندے ہے۔ اُس کا حسن اس وجہ سے ہے کہ وہ فعل خاص خدائے تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اور قبیح اس وجہ سے کہ خدا کے تعالیٰ نے اُس کے ارتکاب سے منع فرمایا ہے۔ خدائے تعالیٰ ے جس چیز کو پیدا کیا خواہ وہ اچھی سمجھی جائے یا بُری۔ اُس کا پیدا کرنا بُرا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز کو خدائے تعالیٰ نے پیدا کیا وہ بری نہیں ہوسکتی کیونکہ برائی اور بھلائی باعتبار آثار ولوازم کے ہوا کرتی ہے۔ نفس شئے کو اُس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے کہ یہ امور اُس کی ذات سے خارج ہیں۔ دیکھئے آگ مثلاً جو خدائے تعالیٰ کی مخلوق ہے اُس کو نہ بری کہنے کی ضرورت ہے نہ اچھے کہنے کی بلکہ صرف وہ آگ ہے۔ اُس کے بعد اگر وہ کسی کو جلا دے تو وہ ضرور کہے گا کیا ہی بُری چیز ہے اور اگر کھانا پکا دے تو اعلیٰ درجے کی نعمت سمجھے گا۔ اسی

پر تمام چیزوں کو قیاس کر لیجئے ۔ سانپ اس وجہ سے بُرا سمجھا جاتا ہے کہ آدمی اُس کے زہر سے ہلاک ہوجاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جذامی کو کاٹے تو اُس کو صحت ہوجاتی ہے۔اس صورت میں جذامی اُس کا عاشق ہوگا۔اور تلاش کر کے اُس سے ملنا چاہیگا۔اس سے ظاہر ہے کہ کوئی چیز فی حد ذاتہ بُری نہیں ۔ بلکہ موجود ہونے کی حیثیت سے اچھی ہے ۔اگر کوئی بُری چیز ہے تو عدم ہے ۔ یہ اشیاء کا حال تھا۔اسی طرح افعال کا حال بھی ہے کہ موجود ہونے کی حیثیت سے کل افعال اچھے ہیں اور نیز اس وجہ سے کہ خاص خدائے تعالیٰ کے پیدا کیئے ہوئے ہیں ۔ جس کی حکمت کا یہ مقتضی نہیں ہوسکتا کہ دیدہ و دانستہ بُری چیز کو پیدا کرے۔غرضکہ فعل بھی فی نفسہ ایک موجود چیز ہے۔جس کی برائی یا بھلائی باعتبار آ ثار ولوازم کے ہوگی ۔ جتنے بُرے کام ہیں چونکہ اُن کے لوازم برے ہیں۔اس وجہ سے وہ بُرے ہیں ورنہ اُن کو بُرے کہنے کی ضرورت نہیں ۔ بسا وقت اچھے کام بھی کسی وجہ سے بُرے ہیں ۔اور بُرے کام اچھے مثلاً کثرت عبادت سے بہتر کوئی چیز نہیں ۔مگر ریا وغیرہ کی وجہ سے وہ بری ہوجاتی ہے۔

کلیدِ درِ دوزخ است آں نماز که از بہر مردم گذاری دراز

لیجئے نماز جو باعث دخولِ جنت ہے وہ دوزخ کی کنجی ہوئی جارہی ہے۔

نفسِ فعل نہ اچھا نہ بُرا : حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے نکلے تھے۔ اُن کا اس ارادے سے راہ طئے کرنا کیسا فعل تھا۔ نبی کے قتل سے بدتر کوئی فعل نہیں ہوسکتا۔ مگر جب اُس فعل کے ذریعہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچکر مشرف با سلام ہوئے تو ایسے فعل کو جو ابدلآ باد تک فضیلت کا باعث ہوا اگر تمام اعمالِ حسنہ سے اچھا کہا جائے تو بے موقع نہ ہوگا۔ دیکھئے۔ یہ ایک ہی فعل ہے یعنی چل کر راہ طے کرنا' ایک اعتبار سے بدترین افعال تھا اور ایک اعتبار سے بہترین افعال ہوا۔ غرضکہ نفسِ فعل نہ برا ہے نہ اچھا۔ بلکہ با عتبار وجود کے اُس کو اچھا بھی کہہ سکتے ہیں۔ جب معلوم ہوگیا کہ افعال میں برائی اور بھلائی بحسب اعتبارات ہے تو اس اعتبار سے کہ آدمی کو جس فعل میں تلذذ ہوا اُسے نعمت کہنے میں کوئی تامل نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ شرعاً ممنوع ہونے کی وجہ سے اُس کا نتیجہ بُرا ہوگا۔ اس اعتبار سے اُس کو بُرا کہنا بھی ضروری ہے۔ مگر ارتکاب کے وقت اُس میں وہ بُرائی موجود نہیں جو آئندہ جزاء کے وقت ہونے والی ہے اس لحاظ سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ فعل تو تلذذ کی وجہ سے نعمت تھا مگر اُس کی جزاء بری ہے جس سے اذیت حاصل ہوگی۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ فعل فی نفسہ

اچھا۔ بلکہ ایک نعمت تھی جو مستوجب شکر ہے۔ اگر مدارج میں خلط نہ کیا جائے تو نفس فعل قابل شکر ہے۔ اور اس کی جزاء قابلِ اجتناب۔ جو لوگ پناہ الٰہی میں آجاتے ہیں اگر اُن سے کوئی گناہ صادر ہو جاتا ہے تو اس لحاظ سے کہ نعمت ہے شکرِ الٰہی دل سے بجالاتے ہیں۔ اور اُس کے ساتھ ہی یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ بے شک ہم سے گناہ صادر ہوا جس کا انجام بُرا ہے اور اُس کے شر سے پناہ مانگتے ہیں۔ چنانچہ یہی بات سید الاستغفار سے ظاہر ہے جس کے یہ الفاظ صحیح احادیث میں وارد ہیں۔ ''اللھم انت ربی لا الہ الا انت خلقتنی و انا عبدک و انا علی عھدک و وعدک ما استطعت اعوذ بک من شر ما صنعت ابوءُ لک بنعمتک علی و ابوءُ بذنبی فاغفرلی فانہ لا یغفر الذنوب الا انت'' یعنی یا اللہ تو میرا رب ہے کوئی معبود تیرے سوا نہیں۔ تو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں۔ اور میں تیرے عہد اور وعدہ پر قائم ہوں جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے جو بُرا کام میں نے کیا اُس کے شر سے میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھ پر تیری نعمت ہے اور اپنے گناہ کا بھی اقرار کرتا ہوں۔ تو خدایا مجھے بخشدے۔ کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو نہیں بخشتا انتہی۔

کامل الایمان کی نشانی: دیکھئے نعمت کا اقرار کرنا اعلیٰ درجہ کا شکر ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف سے ابھی معلوم ہوا۔ اور اس موقع پر سوا اُس تلذذ گناہ کے اور کونسی نعمت تھی۔ پھر اُس کے ساتھ ہی گناہ کا اقرار بھی ہو گیا۔ اور اس کے شر سے پناہ مانگی گئی۔ یہ بات معلوم ہے کہ آدمی کا نفس ہمیشہ اپنی خواہشوں کو پوری کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ خواہ جائز طریقہ سے ہو یا ناجائز اور شیطان ناجائز طریقوں سے پورے کرنے کی تدبیریں بتاتا ہے۔ جب اس قسم کی بات آدمی کو معلوم ہو جاتی ہے تو شیطان کو گناہوں پر جرأت دلانے کا موقع مل جاتا ہے کہ جب وہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے تو نہایت شکر گذاری سے اُس کو حاصل کرنا چاہئے۔ اس قسم کے دھوکہ میں وہی شخص آجاتا ہے جس کا ایمان ضعیف ہو یا برائے نام مسلمانوں میں شریک ہے۔ کامل الایمان ایسے وسوسوں کا لاحول پڑھتا ہے کیونکہ وہ یقیناً جانتا ہے کہ خدائے تعالیٰ گناہوں سے ناراض ہے اور اُن کی سزائیں مقرر کی ہیں اسی وجہ سے گناہ اتفاقاً صادر ہو جائے تو نہایت عجز والحاح سے بارگاہ کبریائی میں عرض کرتا ہے کہ الٰہی میں اقرار کرتا ہوں کہ گناہ مجھ سے صادر ہو گیا۔ اب تیرے سواء کوئی اُس کو بخشنے والا نہیں اُس کے شر سے میں تیری پناہ میں آتا ہوں اُس کو بخشدے۔ اگر ایسا نہ کرے تو

گناہوں کا سلسلہ قائم ہوجاتا ہے اور دل سیاہ اور زنگ آلود ہوجاتا ہے۔ چنانچہ کنز العمال میں روایت ہے کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ ہوجاتا ہے اگر اُس نے چھوڑ دیا اور استغفار اور توبہ کی تو دل کی صیقل ہوجاتی ہے اور اگر پھر کیا تو وہ دھبہ بڑھ جاتا ہے اور اُس کے دل کو گھیر لیتا ہے۔ اسی کا نام ران ہے جس کو خدائے تعالیٰ نے ذکر فرمایا ﴿ کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون ﴾۔(اقتباس از مقاصد الاسلام (۸) ص۱۲۰ تا ۱۴۴)۔

OOO